۱۶

منعم علیہ گروہ وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں جاری کرتا ہے

(فرمودہ ۳؍جون ۱۹۳۸ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

''سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو ایک ایسی دعا سکھلائی ہے جو کئی معنوں میں اپنی جلوہ گری کرتی اور قرآن کریم کے مطالب کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔ وہ دعا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ [1] کہ اے ہمارے ربّ! تُو ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ یعنی اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام نازل کیا۔ ادھر تو یہ دعا سکھائی گئی ہے دوسری طرف قرآن کریم فرماتا ہے کہ مؤمن کی دعا ردّ نہیں کی جاتی۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں جہاں روزوں کے فرض کرنے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے روزے فرض کئے ہیں تا کہ تم میں کامل تقویٰ پیدا ہو۔ یہ روزے خدا تعالیٰ کے اس عہد کا نشان ہیں جو قرآن کریم کے نزول کے ذریعہ سے اس نے دنیا سے باندھا ہے۔ (گویا حضرت ابراہیمؑ کے عہد کا نشان ختنہ تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا نشان رمضان کے روزے ہیں اور امت محمدیہ ان دونوں عہدوں کی وارث بنائی گئی ہے اور اس میں ختنہ ابراہیمی عہد کے اجراء کی علامت ہے اور رمضان کے روزے محمدی عہد کے اجراء کی علامت ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہر عبادت کا ایک بدلہ ہے اور روزہ کا بدلہ میں خود ہوں ۔[۲] اس عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔) پس تم کو چاہئے کہ اس عہد کو پورا کرو اور ہمیشہ اس عہدِ ہدایت کی یاد میں اللہ تعالیٰ کی تکبیر بلند کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے حقیقی عبد ہونے کا ثبوت دو۔

پھر فرماتا ہے وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾[۳] اور جب تجھ سے میرے بندے میری نسبت سوال کریں تو انہیں کہہ دے کہ میں جس نے تم سے یہ نیا عہد باندھا ہے تمہارے قریب ہی ہوں۔ اس عہد کے اندر آئے ہوئے ہر شخص کی جب وہ مجھے پکارے دعا کو مَیں سنتا ہوں۔ پس چاہئے کہ وہ بھی میرے اس عہد میں کامل طور پر داخل ہوں اور میری امداد پر یقین رکھیں تا کہ انہیں رُشد و ہدایت کا راستہ مل جائے۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جو بھی الٰہی عہد کے تابع ہو کر دعا کرتا ہے یا یوں کہو کہ قرآنی اصطلاح کے مطابق مؤمن کامل یا عبد ہو کر دعا کرتا ہے اس کی دعا ضرور سُنی جاتی ہے اور کبھی ضائع نہیں جاتی۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ[۴] یا (مجھے یہ تو بتاؤ کہ) وہ کون ہستی ہے جو سب طرف سے مایوس ہو کر دعا کرنے والے کی طرف جُھکتی ہے اور اُس کی مصیبت کو ٹال دیتی ہے۔ یعنی ایسی ہستی اللہ ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مضطر ہوتے ہیں اُن کی دعائیں سُنی جاتی ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں، خواہ عیسائی ہوں، خواہ سِکھ ہوں، خواہ پارسی ہوں اور خواہ دنیا کے کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ جب کبھی اضطرار کے ساتھ وہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو سُن لیتا ہے۔ وجہ یہ کہ ان کی وہ حالت بھی درحقیقت ایمان کی حالت ہوتی ہے کیونکہ ایک مؤمن اور غیر مؤمن میں فرق یہی ہے کہ مؤمن خدا تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتا ہے اور غیر مؤمن خدا تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں رکھتا، ورنہ تھوڑا بہت ایمان ہر شخص میں پایا جاتا ہے حتّٰی کہ ایک دہریہ کے دل میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ دہریہ بھی کسی نہ کسی بالا طاقت کا ضرور اقرار کرتا ہے۔ پس اگر ایک مؤمن اور غیر مؤمن میں

فرق ہے تو یہی کہ مؤمن خدا تعالیٰ کو ایسی صورت میں دیکھتا ہے جس کے بعد اسے کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ اور غیر مؤمن اسے ایسی صورت میں دیکھتا ہے جس کے ساتھ بہت سے شکوک وابستہ ہوتے ہیں۔ ورنہ تھوڑا بہت ایمان ہر ایک میں پایا جاتا ہے لیکن جب کافر پر بھی حالتِ اضطرار آتی ہے تو اس کا وہ شک جو خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق اس کے دل میں پایا جاتا ہے وقتی طور پر دور ہو جاتا ہے کیونکہ اضطرار کی مثال آگ کی سی ہے جس طرح آگ میں اگر تنکے ڈالے جائیں تو وہ جل جاتے ہیں، لکڑی ڈالی جائے تو وہ بھَسم ہو جاتی ہے اسی طرح اضطرار کی آگ شکوک وشبہات کے خَس وخاشاک کو بالکل جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک غیر مؤمن کے دل میں اسی وقت اضطرار پیدا ہوتا ہے جب اس کے دیوی دیوتا اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، جب اس کے اپنے گھڑے ہوئے خدا اسے بالکل ناکارہ اور بیکار نظر آتے ہیں، جب اس کے اپنے اختیار کئے ہوئے عقائد اسے غیر مکتفی دکھائی دیتے ہیں اور جبکہ ساری دنیا سے نگاہیں ہٹ کر صرف ایک خدا کی ذات اس کے سامنے ہوتی ہے اور وہ گڑگڑاتے اور روتے ہوئے خدا تعالیٰ کے سامنے یہ کہہ کر گر جاتا ہے کہ اے خدا! میری مدد کر۔ جب یہ کیفیت کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو عارضی طور پر وہ اس وقت مؤمن ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کر لیتا ہے۔ تو غیر مؤمن کیلئے مضطر کی شرط ہے۔ مگر مؤمن کیلئے محض اَلدَّاعِ ہونے کی شرط ہے۔ اور قطع نظر اس سے کہ اس پر اضطرار کی حالت وارد ہو یا نہ ہو اور وہ ہلاکت کے قریب پہنچے یا نہ پہنچے اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو سن لیتا ہے۔ تو اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں مؤمن کی دعا کی طرف اشارہ ہے اور اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ میں مؤمن اور کافر سب کی دعا کی طرف اشارہ ہے۔ اب جو خدا کافر اور مؤمن دونوں کی دعائیں سننے والا ہے، کافر کی اُس وقت جب وہ مضطر ہو کر بمنزلہ مؤمن ہو جاتا ہے اور مؤمن کی اُس وقت جب وہ شرعی قواعد کے مطابق خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتا ہے جیسا کہ اَلدَّاعِ کے لفظ میں ال کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود مؤمنوں کو ایک دعا سکھائے اور پھر اسے ردّ کر دے۔ اب یہ جو فرمایا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ خدایا! ہمیں سیدھا رستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راہ جو منعم علیہم ہیں اور جن پر تیری نعمتیں

نازل ہوئیں۔ اس سے دو باتیں نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو منعم علیہ بنانا چاہتا ہے۔ اپنے اپنے درجہ اور مقام کے مطابق کسی کو زیادہ اور کسی کو کم۔ جیسے سکولوں میں انعامات تقسیم ہوتے ہیں تو جماعت کے فرق کے لحاظ سے کسی کو تھوڑا انعام ملتا ہے اور کسی کو بہت۔ جو پرائمری میں اوّل رہتا ہے اسے بھی انعام ملتا ہے، جو مڈل میں اوّل رہتا ہے اسے بھی انعام ملتا ہے اور جو انٹرنس کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اوّل نکلتا ہے اسے بھی انعام کے طور پر وظیفہ ملتا ہے۔ اور ایف اے اور بی اے میں اوّل رہنے والوں کو بھی وظائف ملتے ہیں۔ مگر سارے وظائف ایک مقدار کے نہیں ہوتے۔ پرائمری میں اوّل رہنے والے یا ضلع بھر میں اوّل نکلنے والے کو جو وظیفہ ملتا ہے وہ پانچ سات روپے کا ہوتا ہے اور انعام میں اسے جو چیزیں ملتی ہیں وہ بھی دو چار روپے کی ہوتی ہیں۔ لیکن انٹرنس کے امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اوّل رہنے والے کو بیس پچیس بلکہ تیس روپیہ تک کا وظیفہ مل جاتا ہے اور ایف اے اور بی اے میں جو اوّل نکلتے ہیں اُنہیں تو اس سے بھی زیادہ وظیفہ اور انعام ملتا ہے۔ تو گو منعم علیہ سارے ہی ہیں اس پر بھی انعام ہوا جو پرائمری میں اوّل رہا اور اسے بھی انعام ملا جو بی اے میں اوّل رہا۔ مگر انعاموں میں فرق ہے۔ ایک کو اعلیٰ درجے کا انعام ملا اور ایک کو کم درجے کا۔ تو ایک بات اس دعا میں یہ بتائی گئی ہے کہ جو مؤمن ہوگا وہ ضرور منعم علیہ ہوگا ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ دعا کبھی نہ سکھائی جاتی۔

دوسری بات جس کا اس جگہ سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ اس جگہ منعم علیہ کے لفظ سے دنیا کے عام انعام مراد نہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ ہر ایک کو نصیب ہیں۔ مثلاً آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہیں مگر کیا یہ انعام کافروں کو حاصل نہیں؟ کیا ہندوؤں کی آنکھیں نہیں؟ کیا سکھوں، عیسائیوں اور دہریوں کی آنکھیں نہیں؟ یا کان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں مگر کیا یہ کافروں کو نہیں ملے ہوئے؟ یا ہاتھ پاؤں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں مگر کیا کفار کے ہاتھ پاؤں نہیں؟ یا دنیوی دولت ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے مگر کیا یہ نعمت ان کو میسر نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور مؤمنوں کی نسبت کافر ہزار درجے زیادہ امیر ہیں۔ یا اگر عمارتوں اور مکانوں کا ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے تو یہ نعمت بھی ان کو حاصل ہے بلکہ مؤمنوں سے زیادہ حاصل ہے۔

اسی طرح حکومت اور دبدبہ اور شوکت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمتیں ہیں مگر بعض حالات میں جیسے آجکل کا زمانہ ہے یہ بھی مسلمانوں کی نسبت کفار کو زیادہ حاصل ہوتی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ میں جن انعامات کا ذکر ہے وہ بعض مخصوص قسم کے انعامات ہیں جو صراطِ مستقیم کے ساتھ تخصیص رکھتے ہیں اور جب تک انسان صراطِ مستقیم پر قائم نہیں ہوتا وہ انعامات حاصل نہیں ہوتے۔ گویا دو قاعدے ہیں جو اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر مؤمن کیلئے منعم علیہ ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ تسلیم کرنا کہ کوئی شخص مؤمن تو ہے مگر اسے صراطِ مستقیم نہیں مِلا بالکل غلط بات ہوگی۔ اور اس فقرہ کو اگر ہم سادہ اردو میں بیان کریں تو یوں بنے گا کہ فلاں شخص بڑا مؤمن ہے مگر اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اب کیا کوئی شخص مان سکتا ہے کہ کوئی شخص مؤمن بھی ہو اور خدا تعالیٰ سے اس کا تعلق بھی نہ ہو۔ جب صراطِ مستقیم کے معنے اللہ تعالیٰ سے تعلق کے ہی ہیں تو یہ کہنا کہ فلاں مؤمن ہے مگر اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق نہیں، بیہودہ بات ہوگی۔ جو بھی مؤمن ہوگا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کا ضرور تعلق ہوگا۔

پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں درحقیقت حصولِ ایمان کے متعلق یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے خدا! ہمارے ایمان کو کامل کر اور ہمیں منعم علیہ گروہ میں شامل فرما۔ گویا منعم علیہ گروہ میں شامل ہونا ایمان کے کمال کی ایک علامت ہے اور ایمان کے کمال کے دوسرے معنے منعم علیہ گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔ پس ہر مؤمن اپنے اپنے درجہ کے مطابق منعم علیہ گروہ میں شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ جو انعام اِس جگہ مذکور ہے وہ ایسا نہیں جیسے دُنیوی رُتبے یا جائدادیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں مگر اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی نعمتوں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دُنیوی نعمتیں اُن روحانی نعمتوں کی محض توابع ہیں۔ جیسے آقا کے ساتھ خادم ہوتے ہیں اسی طرح روحانی نعمتوں کے ساتھ یہ بطور خادم ہوتی ہیں۔ آخر جس انسان کو اللہ تعالیٰ جہاد کی توفیق دے گا اُسے دولت بھی بخشے گا، اُسے فتح بھی دے گا، اُسے مالِ غنیمت بھی عطا کرے گا۔ مگر یہ ادنیٰ چیزیں اُس کا مقصود نہیں ہوں گی، یہ ادنیٰ نعمتیں ہیں جو اُسے حاصل ہوں گی ورنہ اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی جو بہت بڑی چیز ہے۔ اس کی

ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک دوست دوسرے دوست کے ہاں بعض دفعہ ملاقات کیلئے چلا جاتا ہے تو وہ اس کی خاطر تواضع کیلئے اس کیلئے کھانا پکواتا ہے اور اگر امیر ہو تو کئی قسم کے کھانے تیار کراتا ہے اور اگر غریب ہو تب بھی وہ اچھی سے اچھی چیز اس کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ کھانا اس کا مقصود نہیں ہوگا بلکہ اس کا اصل مقصد دوست سے ملاقات کرنا ہوگا اور وہ چاہے گا کہ میں اپنے دوست کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کروں چاہے کھانا مجھے ملے یا نہ ملے۔ اسی طرح اس دنیا کی نعمتیں مؤمن کو مل تو جاتی ہیں مگر وہ اس کا مقصود نہیں ہوتیں۔ مقصود والا انعام بالکل اَور ہے۔

اب وہ انعام جو اس دعا کے نتیجہ میں مؤمن کو ملتا ہے وہ کچھ بھی ہو قرآن کریم انعامِ الٰہی کے متعلق یہ ہدایت دیتا ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔[5] تُو اپنے رب کی نعمت کو لوگوں کے سامنے پیش کر۔ اپنے عمل سے بھی اور اپنے قول سے بھی کیونکہ تحدیث بِالنعمت کے لفظی معنے گو صرف اتنے ہی ہیں کہ نعمت کو بیان کرنا مگر عربی زبان کے محاورہ کے لحاظ سے تحدیث بِالنعمت کے معنی یہ ہیں کہ شکرگزاری کے طور پر عملی رنگ میں دنیا پر یہ ظاہر کرنا کہ میں اس نعمت کی واقعہ میں قدر کرتا ہوں کیونکہ تحدیث باب تفعیل سے ہے اور یہ باب معنوں میں کثرت و وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ کسی کو کوئی خاص اعزاز حاصل ہو یا بڑا انعام ملے تو وہ اس خوشی میں لوگوں کی دعوت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تحدیث بِالنعمت کے طور پر یہ دعوت کر رہا ہوں حالانکہ وہ اس وقت کھانا کِھلا رہا ہوتا ہے کوئی تقریر نہیں کر رہا ہوتا اور اگر بِالفرض وہ کھانا نہ کھلائے اور محض لوگوں کو بُلا کر یہ خبر سنا دے کہ مجھے فلاں اعزاز حاصل ہؤا ہے تب بھی لفظی طور پر وہ تحدیث بِالنعمت کا مفہوم پورا کرسکتا ہے۔ لیکن محاورہ کے لحاظ سے تحدیث بِالنعمت کے جو معنے ہیں ان کو وہ پورا کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو خان بہادر کا خطاب ملے اور وہ لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک تقریر شروع کر دے اور کہے لوگو مجھے خان بہادر کا خطاب ملا ہے اور میں آپ سب کو اس کی اطلاع دیتا ہوں تو لوگ اس کی بات سن کر ہنسیں گے اور کہیں گے میاں! اگر تم نے صرف اتنی بات بتانی تھی تو ہمیں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت تھی، ہم اخباروں میں ہی یہ خبر پڑھ سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ اس خوشی میں اپنے دوستوں کی دعوت کرتا ہے اور انہیں کھانے یا چائے پر

مدعو کرتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تحدیث بِالنعمت کی یا کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو لفظی طور پر تحدیث بِالنعمت کا مفہوم ادا کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ لوگوں سے کہہ دے کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے لیکن محاورہ کے طور پر تحدیث بِالنعمت کا مفہوم اُس وقت تک ادا نہیں ہوگا جب تک وہ غریبوں کو کھانا نہ کھلائے یا انہیں کپڑے نہ پہنائے۔ ہاں جب وہ غریبوں کو کھانا کھلاتا یا ننگوں کو کپڑے پہناتا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا عملی رنگ میں شکریہ ادا کرتا ہے تب کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے تحدیث بِالنعمت کی۔ تو اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے صرف یہی معنے نہیں کہ تُو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ مجھے فلاں انعام ملا اور گو لفظی طور پر یہ معنے بھی درست ہیں مگر محاورہ کے لحاظ سے درست نہیں کیونکہ محاورہ میں تحدیث بِالنعمت کے یہ معنے ہیں کہ منہ سے اقرار کرے اور عملاً کوئی ایسا فعل کرے جو اس بات پر دلالت کرے کہ اس نے واقع میں اس نعمت کی قدر کی ہے۔ پس اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے یہ معنی ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت نازل ہو اُس کا زبان سے اظہار کرو اور اُس کے شکریہ میں ایسے اعمال بجالاؤ جو دنیا کو فائدہ اور آرام پہنچانے والے ہوں۔ جب کوئی شخص اِن دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے تحدیث بِالنعمت کرتا ہے تو اُس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کی۔

اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مجھ سے انعام مانگو اور دوسری طرف اس کے سیاق وسباق سے اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے جو چیز مانگی جائے، بِالخصوص ایسی چیز جس کے مانگنے کا وہ خود حکم دے وہ انسان کو ضرور دیتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے کہ تم اِس نعمت کا اظہار کرو جو تمہیں ملے اور شکر اور امتنان کا کوئی طریقہ اختیار کرو جس سے معلوم ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کرنے والے ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مؤمن کو جو نعمت ملتی ہے اور جس کا اس آیت میں بھی ذکر کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ سب سے اعلیٰ نعمت جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا ہے نبوت ہے اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو یہ سکھلایا ہے کہ تم ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تم میں اپنی اِس نعمتِ نبوت کو قائم رکھے۔ اب نبی اپنی نعمت کی تحدیث کس طرح کرتے ہیں سو یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نبی اپنی نعمت کی تحدیث اِس طرح کرتے ہیں کہ وہ دنیا

کو الٰہی پیغام پہنچاتے چلے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ لوگ اُنہیں دکھ دیں، اُن کا بائیکاٹ کریں، اُنہیں گالیاں دیں، اُنہیں ماریں یا اُنہیں پیٹیں وہ اپنی بات لوگوں کے کانوں میں ڈالتے چلے جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس نعمت کا عملی رنگ میں شکر یہ یہی ہے کہ ہم تمام دنیا کے عذاب اپنے سر پر اٹھالیں۔ پھر ان کی اُمتیں اُن کی تابع ہوکر ساری دنیا میں تبلیغِ دین کرتیں اور لوگوں کو صداقت کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ وہ بھی بڑے بڑے دکھ اُٹھاتی ہیں اور ان پر بھی بڑے بڑے مصائب وارد ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا پہلے انبیاء کی جماعتوں میں بعض لوگ ایسے گزرے ہیں جنہیں دشمنوں نے آروں سے چِیر ڈالا مگر انہوں نے اُف تک نہ کی۔[6]

ہماری اپنی جماعت میں بھی اس رنگ کی تحدیث بِالنعمت کے بعض واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کو جس وقت شہید کیا گیا ہے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ اِدھر اُن پر پتھر پڑ رہے تھے اور اُدھر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کرتے جارہے تھے کہ یا اللہ! میری قوم نادانی سے یہ فعل کر رہی ہے تُو اسے معاف کردے۔ یہ سچی تحدیث بِالنعمت ہے جو اُن سے ظاہر ہوئی کہ آخری وقت میں بھی ان کے دل میں یہی خیال آیا کہ میں نے جس عظیم الشان نعمت کو حاصل کیا ہے مجھے عذاب دینے والے اس سے محروم نہ رہیں اور چاہے وہ مجھے دُکھ دے رہے ہیں میں ان کے متعلق یہی دعا کروں کہ خدا انہیں معاف کرے اور انہیں احمدیت کی شناخت کی توفیق عطا کرے۔

غرض نبوت پہلا اور سب سے بڑا انعام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو دیتا ہے۔ پھر اس سے اُتر کر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیقیت کا مقام ہے۔ جب انسان نبیوں کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے اس قدر بلند مرتبہ حاصل کرلیتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے نبیوں والا سلوک شروع کردیتا ہے۔ وہ نبی نہیں ہوتے مگر خدا تعالیٰ کی غیرت ان کیلئے ایسی ہی بھڑکتی ہے جیسے نبیوں کیلئے، وہ نبی نہیں ہوتے مگر اللہ تعالیٰ ان کی زبان پر اسی طرح صداقت جاری کرتا ہے جس طرح نبیوں کی زبان پر وہ کامل مظہر ہوجاتے ہیں اس مقام کا کہ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ**۔[7] جس چیز کو وہ کہہ دیں کہ یہ دین ہے خدا تعالیٰ اُسی کو قائم کرتا ہے اور

جس چیز کو دنیا دین کہہ رہی ہو خدا تعالیٰ اسے مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ درحقیقت یہ نبوت کا مقام ہی ہے کیونکہ نبی ہی ہیں جو دین کے قیام کیلئے بھیجے جاتے ہیں اور گو وہ نبی نہیں ہوتے مگر نبوت کے مقام کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ گویا وہی ہو جاتے ہیں۔ جس طرح لوہا جب آگ میں ڈالا جائے تو آگ کی شکل اور گرمی اور خواص سب اپنے اندر لے لیتا ہے اسی طرح وہ انبیاء کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ان کی تمام خصوصیات کے ایک حد تک حامل ہو جاتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ لوہا جب آگ میں ڈالا جائے تو گو وہ انگارہ نہیں بن جاتا مگر پھر بھی آگ کے تمام خواص ظاہر کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ ویسے ہی جلاتا ہے جیسے آگ جلاتی ہے، وہ ویسا ہی گرمی پہنچاتا ہے جیسے آگ گرمی پہنچاتی ہے، وہ ویسی ہی شکل رکھتا ہے جیسی آگ کی شکل ہوتی ہے۔ غرض رنگ، شکل اور خواص کے لحاظ سے اس میں اور آگ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسی طرح صدیق مقامِ نبوت کے اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی باتوں کو نبیوں کی باتیں قرار دے دیتا ہے جس طرح نبیوں کی باتوں کو وہ اپنی باتیں قرار دیتا ہے۔

پھر تیسرا گروہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شُھَدَاء کا ہوتا ہے اور گو شُھَدَاء کیلئے خدا تعالیٰ کی غیرت اتنی نہیں بھڑکتی جتنی صدیقوں کیلئے بھڑکتی ہے۔ پھر بھی وہ چلتے پھرتے خدا تعالیٰ کے گواہ ہوتے ہیں اور دنیا میں اگر کسی نے چلتے پھرتے جنتی کو دیکھنا ہو تو ان کو دیکھ لے۔ اگر دنیا میں کسی نے خدا تعالیٰ کے پیاروں کو دیکھنا ہو تو ان کو دیکھ لے۔ وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کیلئے آئینہ کا رنگ رکھتے ہیں مگر ان میں اور صدیق میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یعنی صدیق کی مثال تو ایک ایسے آئینہ کی ہے جس میں تصویر ثبت کر دی گئی ہے جسے جب بھی دیکھو اس میں محبوب کے ہو بہو خدوخال نظر آئیں گے۔ آج دیکھو تو آج اور کل دیکھو تو کل۔ لیکن شہید کی مثال اُس آئینے کی طرح ہے جو گو بنایا اسی لئے گیا ہے کہ محبوب کا چہرہ اس میں نظر آئے مگر پھر بھی اس میں محبوب کی تصویر مستقل طور پر کندہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ شیشہ اپنی ذات میں بھی ایک قیمتی اور مصفّٰی چیز ہوتا ہے۔ جب محبوب کا چہرہ اس میں نظر آ رہا ہو تب بھی وہ قیمتی ہوتا ہے اور جب محبوب کا چہرہ اس میں نظر نہیں آ رہا ہوتا تب بھی وہ قیمتی ہوتا ہے مگر بہرحال اس آئینہ میں محبوب کی تصویر دائمی طور پر ثبت نہیں کر دی جاتی۔ ہاں اکثر اس میں محبوب کی شکل نظر آتی ہے کیونکہ شہید وہ آئینہ ہے جو

ہر وقت محبوب کے سامنے رکھا رہتا ہے۔ جیسے لوگ کام کی میز پر یا رہائش کے کمرہ میں آئینہ لگا دیتے ہیں۔ پس شہید کی مثال ایسے شیشے کی سی ہے جو قریباً ہر وقت سامنے رہتا ہے۔ یوں تو اس کے ہر دوسرے لحظہ کا عکس مختلف ہوتا ہے لیکن بوجہ اس کے کہ وہ سامنے رکھنے کے لئے چُن لیا گیا ہے قریباً ہر وقت اس میں چہرے کا انعکاس پڑتا رہتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا درجہ صالح کا ہے۔ صالح کے معنی ہیں قابلیت رکھنے والا انسان۔ یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ایک مقام تک نہیں پہنچی ہوتیں مگر ان میں اس مقام تک پہنچنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ منطقیوں نے اسی بناء پر کہا ہے کہ بعض چیزیں کسی خاصہ کی بِالقُوّۃ مظہر ہوتی ہیں اور بعض بِالفعل۔ یعنی بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جن میں کسی خاص قابلیت کے حصول کی قوت تو ہوتی ہے لیکن عملاً انہوں نے وہ قوت حاصل نہیں کی ہوئی ہوتی اور بعض وہ ہوتی ہیں جو عملاً بھی وہ قوت ظاہر کر رہی ہوتی ہیں۔ شہید کا جو مقام ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے سامنے پڑا ہوا شیشہ۔ کیونکہ شاہد کے معنے دیکھنے والے کے ہیں۔ گویا شہید ایک ایسا شیشہ ہے جو ہر وقت محبوب کے سامنے پڑا ہوا ہے اور جب بھی کوئی شخص اس میں دیکھتا ہے اس میں محبوب کا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ اور صالح کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہر وقت سامنے پڑا ہوا تو نہیں مگر اس میں ایسی قابلیت موجود ہے کہ جب بھی خدا تعالیٰ اپنا چہرہ اس میں سے دکھانا چاہے وہ دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ گویا شہید اور صالح کے مقام میں وہی فرق ہے جو ان دو آئینوں میں ہے کہ ان میں سے ایک ہر وقت کمروں میں لٹکے رہتے ہیں اور دوسرے جیب یا ٹرنک میں رکھے رہتے ہیں۔ اب جو شیشہ کمرہ میں ہر وقت سامنے ہوگا اس میں سے اکثر مکین کی صورت نظر آ جائے گی کیونکہ مکین اکثر مکان میں ہی رہتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی وقت اگر مکین وہاں نہ ہو تو وہ اس کی صورت نہ دکھا سکے۔ اسی طرح شہید گو ہر وقت خدا تعالیٰ کا چہرہ اپنے آئینہ قلب میں سے نہیں دکھا سکتا مگر چونکہ وہ اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں اکثر محبوبِ حقیقی نے جلوہ گر رہنا ہے اس لئے اکثر اس کا چہرہ اس کیلئے آئینہ میں ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن صالحیت کا مقام وہ ہے جس میں چہرہ دکھانے کی قابلیت تو پیدا ہو جاتی ہے مگر اِس رُتبہ کو نہیں پہنچتا کہ ہر وقت سامنے رہے۔ وہ جب کبھی سامنے آ جاتا ہے محبوب کا چہرہ دکھا دیتا ہے اور جب ایک طرف ہو جاتا ہے تو محبوب کا چہرہ نہیں دکھا سکتا لیکن بہر حال اس میں

شکل دکھانے کی قابلیت موجود رہتی ہے۔ اسی طرح جو شیشہ سامنے پڑا ہوا ہو اس کے سامنے سے بھی کبھی انسان ایک طرف ہو جاتا ہے مگر غائب ہونے کا وقت بہت کم ہوتا ہے اور سامنے رہنے کا وقت بہت زیادہ۔ غرض صدیق، شہید، صالح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جن میں سے بعض کا مقام زیادہ اہم ہے اور بعض کا کم۔ صدیق وہ ہے جو اصل کی تصویر بن جاتا ہے اور جس کی حالت ؎

من تُو شدم تُو من شدی من تن شدم تُو جان شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تُو دیگری

کا مصداق ہوتی ہے۔ اسے سامنے رکھو تب بھی وہ وہی صورت دکھائے گا جو اصل کی ہے اور اگر اسے الگ لے جاؤ تب بھی وہ وہی صورت دکھائے گا۔ اگر ایک میل دور لے جاؤ تب بھی اور اگر ہزاروں میل پرے جاؤ تب بھی تمہیں اصل اور تصویر کے نقوش میں کوئی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ یہی حال صدیق کا ہوتا ہے اس میں مستقل طور پر رسول کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی ہو بہو وہی شکل ہو جاتی ہے جو نبی کی ہوتی ہے مگر اس کے برخلاف شہید اکثر اوقات میں نبوت کے نقوش کو پیش کرنے والا شیشہ ہے اور صالح وہ ہے جو نبوت کے نقوش تو دکھاتا ہے لیکن اس اظہار میں نمایاں وقفے پڑتے رہتے ہیں۔

یہ وہ چار انعامات ہیں جن کا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر فرمایا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیادہ تر مقصود اس آیت میں یہی چار انعام ہیں۔ باقی سب انعامات ان کے تابع ہیں اور چونکہ ان چاروں انعامات سے باہر اور کوئی روحانی انعام نہیں ہوسکتا اس لئے مؤمن یا نبی ہوگا یا مؤمن صدیق ہوگا یا مؤمن شہید ہوگا یا مؤمن صالح ہوگا۔ اور اگر ان چاروں مقامات میں سے کوئی بھی مقام اسے حاصل نہ ہو تو وہ مؤمن نہیں ہوسکتا۔ ان ساروں کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ منعم علیہم ہیں۔ اب جبکہ منعم علیہ گروہ کی تعیین ہوگئی تو سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے رب کی نعمت کی تحدیث کرو اور عملی طور پر ایسے کام بجالاؤ جن سے معلوم ہو کہ تمہیں واقع میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر مؤمن کیلئے تحدیث بِالنعمت لازمی ہے اور چونکہ مؤمن بغیر انعام کے

نہیں ہوسکتا اور اور نعمت بغیر تحدیث کے نہیں ہوسکتی اس لئے ہر مؤمن کیلئے تحدیث بِالنعمت ضروری ہے۔ دراصل ایمان کا مقام احسان کا مقام ہے اور مؤمن اور محسن ایک ہی چیز ہیں۔ کوئی مؤمن ایسا نہیں ہوسکتا جو محسن نہ ہو اور کوئی ایسا حقیقی محسن نہیں ہوسکتا جو مؤمن نہ ہو۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ جیسے ایمان کے مختلف مدارج ہیں اسی طرح احسان کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ مگر بہرحال وہ شخص جس میں کامل درجہ پر ایمان پایا جائے گا اس میں کامل درجہ پر احسان بھی پایا جائے گا اور جس میں کم درجہ کا ایمان ہوگا اس میں کم درجہ کا احسان پایا جائے گا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محسن وہ ہے جو اس یقین اور وثوق کے ساتھ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ یقین اسے حاصل نہ ہو تو اس سے اُتر کر اس میں اتنا یقین ضرور ہوتا ہے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔[8] گویا محسن کی دو حالتوں میں سے ایک حالت ضرور ہوتی ہے یا تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جس وقت وہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی شکل اس کے سامنے آجاتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تو یہ کہنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کاملہ کا نقشہ اس کے سامنے کھچ جاتا ہے اور اس کے انعامات اسے یاد آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اور جب وہ کہتا ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اس کیلئے اسے کہیں دُور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کے دل میں بیٹھا ہوُا ہوتا ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان اس کے سامنے آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ تو اس کی صفت رحمانیت کی جلوہ گری سامنے آجاتی ہے۔ جب الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو اس کی رحیمیت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے اور جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو اس کی مالکیت کا تصور اس کے جسم کے ذرہ ذرہ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جھُکا دیتا ہے۔ گویا وہ صرف اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کے اسماء نہیں نکالتا بلکہ اپنی ذات میں اس کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیتِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی صفات کو جلوہ گر ہوتا ہوُا پاتا ہے۔ پس محسن کی یا تو یہ حالت ہوتی ہے اور یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے اُتر کر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ عبادت کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو گو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے مگر بہرحال وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔

یہ ادنیٰ درجہ ہے جو انسان کو نیکی کے راستہ پر قائم رکھتا ہے کیونکہ جب اُسے یہ یقین ہو کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے تو لازماً وہ سنبھال سنبھال کر قدم رکھتا ہے اور گناہوں کا آسانی سے شکار نہیں ہوتا۔

غرض محسنِ کامل ہونا تو بہت بڑی نعمت ہے لیکن دنیا میں ادنیٰ محسن بھی ہوتے ہیں جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی جگہ فرما دیا کہ اعلیٰ محسن تو وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی اس رنگ میں عبادت کرے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور احسان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان یہ یقین رکھتے ہوئے عبادت کرے کہ خدا اُس کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح مؤمنوں میں سے بھی بعض ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور بعض اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں مگر جو ادنیٰ ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول کر لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ مؤمن جس حالت میں بھی ہو خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ منعم علیہ گروہ سے باہر نہیں ہوتا۔ دنیا میں عام طور پر جنہیں ہم تندرست کہا کرتے ہیں ان میں بھی کئی بیماریاں پائی جاتی ہیں مگر ہم انہیں بیمار نہیں کہتے اور نہ وہ خود یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کام کے قابل نہیں۔ بعض دفعہ ایک جرنیل ہوتا ہے مگر کسی ادنیٰ سی مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک پہلوان ہوتا ہے اور وہ بھی کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے مگر ان معمولی امراض سے پہلوان اپنی پہلوانی کے فن کو اور جرنیل اپنی فوج کی نگرانی کو ترک نہیں کر دیا کرتا کیونکہ ان کی صحت کی زیادتی ان کی بیماری کی کمزوری پر غالب آئی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح مؤمنوں میں سے بھی کسی میں کوئی کمزوری ہوتی ہے اور کسی میں کوئی مگر ان کمزوریوں کی وجہ سے وہ منعم علیہ گروہ میں سے نہیں نکل جاتے کیونکہ اُن کی نیکیاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کی کمزوریاں بالکل چھُپ جاتی ہیں۔ بہرحال جبکہ ہر مؤمن منعم علیہ گروہ میں شامل ہے تو ہر مؤمن کیلئے تحدیث بِالنعمت بھی ضروری ہے اور تحدیث بِالنعمت یہی ہے کہ عملی رنگ میں دنیا کو فائدہ پہنچایا جائے اور جو کچھ بھی خدا تعالیٰ دے اس سے دوسروں کو متمتع کیا جائے۔ اگر دین ملے تو دوسروں تک دین پہنچایا جائے، اگر عرفان ملے تو عرفان دیا جائے، اگر علم ملے تو علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، غرض مؤمن کا مقام اللہ تعالیٰ نے محسن کا مقام رکھا ہے اور جب خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور ادھر یہ فرماتا ہے کہ ہر مؤمن منعم علیہ گروہ میں شامل ہے تو معلوم ہوا کہ

کوئی مؤمن ایسا نہیں جو محسن نہ ہو اور کوئی مؤمن ایسا نہیں جس کا یہ فرض نہ ہو کہ وہ دنیا کو اپنی تمام طاقتوں سے فائدہ نہ پہنچائے۔ اِس نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری جماعت کو یہ امر سوچنا چاہیئے کہ اس کے تمام کام بنی نوع انسان کو فوائد پہنچانے کیلئے ہیں یا اپنی ذات کو نفع پہنچانے کیلئے؟

میں نے جو خدام الاحمدیہ نام کی ایک مجلس قائم کی ہے اس کے ذریعہ اسی روح کو میں نے جماعت میں قائم کرنا چاہا ہے اور اس کے ہر رُکن کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو ایسے رنگ میں استعمال کرے کہ اپنے فوائد کو وہ بالکل بھلا دے اور دوسروں کو نفع پہنچانا اپنا منتہٰی قرار دے دے۔ چنانچہ جہاں جہاں بھی اِس کے ماتحت کام کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوسرے لوگ بھی اس سے متأثر ہوئے ہیں اور خود انہوں نے بھی اپنی روحانیت میں بہت بڑا فرق محسوس کیا ہوگا کیونکہ جب کوئی شخص ایک منٹ کیلئے بھی اپنے فوائد کو نظر انداز کر کے دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے خیال سے کوئی کام کرتا ہے اُس ایک منٹ کیلئے وہ خدا تعالیٰ کا مظہر بن جاتا ہے۔ کیونکہ خدا ہی ہے جو اپنے فائدہ کیلئے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کیلئے تمام کام کرتا ہے۔ وہ غنی ہے اور اِس بات سے بے نیاز ہے کہ اُسے کوئی فائدہ ہو۔ وہ جو بھی کام کرتا ہے مخلوق کیلئے کرتا ہے۔ پس جس گھڑی بندہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کا فائدہ اُس کی ذات کو نہیں پہنچتا بلکہ دوسروں کو پہنچتا ہے تو اُس گھڑی میں وہ خدا نما آئینہ ہوتا ہے جس میں سے خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آ رہا ہوتا ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جو چیز ایک وقت انسان کے ساتھ وابستہ ہوگی وہ بعد میں بھی اپنا اثر دکھائے گی۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم جمعہ کیلئے آؤ تو اپنے کپڑوں کو خوشبو لگا کر آؤ۔[9] اب خوشبو لگانا ایک منٹ کا کام ہے مگر وہ خوشبو بعد میں بھی گھنٹہ دو گھنٹے، ایک دن دو دن بلکہ ہفتہ ہفتہ تک جیسی جیسی قیمتی خوشبو ہوتی ہے قائم رہتی ہے۔ بارش برستی ہے اور وہ محدود وقت میں برستی ہے مگر اُس کی ٹھنڈک کا اثر دنوں چلا جاتا ہے۔ آگ جلتی ہے تو گو بعد میں بجھ بھی جاتی ہے مگر کمرے میں پھر بھی بہت دیر تک گرمی قائم رہتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی مؤمن خدا نما ہو جاتا ہے اور وہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جس میں وہ اپنے فائدے کو بالکل نظر انداز کر دیتا اور محض دوسروں کو فائدہ پہنچانا اپنا منتہٰی قرار دے

لیتا ہے تو اُس وقت وہ خدا تعالیٰ کا مظہر بن ہو جاتا ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ عطر کا ایک چھینٹا جب کپڑوں پر پڑے تو وہ کئی کئی دن تک انسانی دماغ کو معطر رکھے سورج چڑھے اور اس کے غروب ہونے کے بعد بھی زمین سے گرمی کی لپٹیں آتی رہیں۔ بارش برسے اور اس کے کئی کئی دن بعد بھی ٹھنڈک محسوس ہوتی رہے مگر خدا کسی جسم میں آئے اور اس کا اثر کام کے ختم ہوتے ہی غائب ہو جائے۔ اگر تم ایک منٹ کیلئے بھی خدا تعالیٰ کا مظہر بن جاتے ہو تو یقیناً اس کے گھنٹوں بعد کی تمہاری حالت بھی خدا نما ہوگی اور تم ایک منٹ میں جو کام کرو گے اس کے بدلے کئی گھنٹوں کیلئے خدا تعالیٰ کے مظہر بن جاؤ گے۔ اور اگر تم اس ایک منٹ کو ترقی دیتے چلے جاؤ تو پھر تم چوبیس گھنٹے ہی خدا تعالیٰ کے مظہر بن سکتے ہو۔ چاہے دنیا کے نزدیک تم نے خدمتِ خلق کیلئے ایک یا دو گھنٹے وقت دیا ہو۔ جس طرح آگ بجھ جاتی ہے مگر کمرہ پھر بھی گرم رہتا ہے، بارش برس جاتی ہے مگر خنکی پھر بھی قائم رہتی ہے اسی طرح ہوتے ہوتے تمہاری یہ حالت ہو جائے گی کہ تمہارا گھنٹے دو گھنٹے کا کام اپنے اثرات کے لحاظ سے چوبیس گھنٹوں پر پھیل جائے گا اور پھر کل کا کام اس اثر کو اَور بڑھائے گا اور پرسوں کا کام اس اثر کو اَور ترقی دے گا یہاں تک کہ بالکل ممکن ہے بلکہ غالب ترین بات یہ ہے کہ تمہاری روحانیت اس قدر ترقی کر جائے اور تمہاری نیتیں اتنی صاف ہو جائیں کہ وہ دو گھنٹے کا کام نہ صرف تمہیں باقی بائیس گھنٹوں کیلئے خدا تعالیٰ کا مظہر بنا دے بلکہ جب دوسرا دن چڑھے تو اُس دن جو کام تم خدا تعالیٰ کے نمونہ پر کرو صرف اُسی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے مظہر نہ بنو بلکہ پہلے دن کی مظہریت ابھی باقی ہو اور وہ دونوں مل کر تمہارے نور کو اَور بھی بڑھا دیں اور ہوتے ہوتے ایک غیر محدود ذخیرہ انعکاساتِ الٰہیہ کا تمہارے جسم میں جمع ہو جائے۔

آخر یہی وہ طریق ہے جس کے ماتحت کسی انسان کی تمام زندگی اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کہلاتی ہے۔ ورنہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس قسم کا بنایا ہے اس کے لحاظ سے ۲۴ گھنٹے وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کا مظہر نہیں بن سکتا۔ آج تک کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جو سوتا نہ ہو، یا کھانا نہ کھاتا ہو، یا پانی نہ پیتا ہو، یا پاخانہ پیشاب نہ کرتا ہو، یا نہاتا دھوتا نہ ہو، یا بیوی بچوں کا فکر نہ کرتا ہو۔ یہ ساری ضروریات نبیوں کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں پھر کیونکر خدا تعالیٰ نے ان کی ہر حرکت اور

ان کا ہر سکون اپنی راہ میں قرار دیا اور کیونکر کہہ دیا کہ ان کا ہر کام میری رضا کیلئے ہے۔ اس کی تہہ میں دراصل وہی بات ہے جو میں نے بتائی ہے اور جس کی مثال میں مَیں نے بتایا ہے کہ عطر لگانے کے بعد تم گھنٹوں بلکہ دنوں تک اس کی خوشبو محسوس کرتے ہو۔ کمرہ میں آگ جلاتے ہو تو اس کے بجھنے کے بعد بھی اس کی گرمی محسوس کرتے ہو۔ اسی طرح انبیاء خدا تعالیٰ کی محبت میں اس قدر محو ہوتے ہیں کہ جب وہ سوتے ہیں اُس وقت بھی ان پر یہی محویت طاری ہوتی ہے، جب اٹھتے ہیں اس وقت بھی یہی محویت ہوتی ہے، جب کھاتے ہیں اُس وقت بھی اور جب پیتے ہیں اُس وقت بھی، اِس طرح اُن کی نیند بھی خدا کیلئے ہوتی ہے اور اُن کی بیداری بھی، اُن کا کھانا بھی خدا کے لئے ہوتا اور اُن کا پینا بھی۔ اسی طرح اُن کا اُٹھنا، اُن کا بیٹھنا، اُن کا نہانا، اُن کا پیشاب پاخانہ کرنا سب خدا کیلئے ہوتا ہے۔ وہ کام دنیا کو دنیا کے نظر آتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی نگاہ میں وہ اُس کیلئے ہوتے ہیں کیونکہ اُن کاموں میں وہی خوشبو سمائی ہوئی ہوتی ہے جو خوشبو اُن کی زندگی کا اصل مقصود ہوتی ہے۔ تو جب محض لِلّٰہ کوئی شخص کام کرتا ہے اُس وقت اُس کی باقی گھڑیوں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ پس مؤمن کو اپنے کاموں میں لِلّٰہیت کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو ایک ایسے ماحول میں پیدا کیا ہے کہ ہمیں سزائیں بھی دینی پڑتی ہیں، ہمیں گرفتیں بھی کرنی پڑتی ہیں، ہمیں سیاستِ اسلام کو بھی قائم کرنا پڑتا ہے مگر باوجود اس کے چونکہ بندہ خدا تعالیٰ کا ظل ہے اور خدا تعالیٰ اپنے متعلق یہ فرماتا ہے کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[10] اس لئے ہمیں معافیاں بھی دینی پڑتی ہیں، درگزر بھی کرنا پڑتا ہے اور چشم پوشیاں بھی کرنی پڑتی ہیں۔

کئی نادان ہیں جو ان باتوں کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض تو وہ ہیں جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ کیوں زیادہ سختی نہیں کی جاتی اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں نرمی نہیں کی جاتی وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم اس خدا کے مظہر ہیں جو نرمی بھی کرتا ہے اور سختی بھی۔ وہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا بھی دیتا ہے اور کئی مجرموں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ مؤمن تو خدا تعالیٰ کا ظِلّ ہے ورنہ اپنی ذات میں مؤمن کوئی چیز نہیں، اپنی ذات میں نبی بھی کوئی چیز نہیں۔ نبی کی قیمت اسی لئے ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ظِل ہے، صدیق کی قیمت بھی اسی لئے ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ظِلّ ہے،

شہید کی قیمت بھی اسی لئے ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ظِل ہے اور صالح کی قیمت بھی اسی لئے ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ظِل ہے۔ کوئی بڑا سایہ ہے اور کوئی چھوٹا۔ اپنی ذات میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو حیّ اور قیّوم ہے۔ جو پہلے بھی تھا، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ باقی چیزیں آئیں اور فنا ہو گئیں، آئیں اور مٹ گئیں۔ ان کو اگر زندگی ملتی ہے جیسے مَابَعْدَالْمَوْت حیات دی جاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے طفیل ملتی ہے۔ اپنی ذات میں ان کے اندر کوئی ایسی خوبی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ ابدی زندگی کے مستحق ہوں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک چھوٹا بچہ جو چل بھی نہیں سکتا ہو سکتا ہے اسے ایک مضبوط انسان اپنی گود میں اُٹھالے اور بھاگ پڑے۔ اب بچہ یقیناً اس جگہ نہیں ہو سکتا جہاں وہ ایک منٹ پہلے تھا۔ وہ اگر پہلے اس جگہ تھا تو ایک منٹ کے بعد پندرہ بیس گز دور چلا جائے گا پھر اور دور چلا جائے گا اور پھر بالکل نظروں سے اوجھل ہو جائے گا مگر وہ بچہ نہیں چل رہا بلکہ آدمی چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حیاتِ ابدی مرنے کے بعد انسان کو ملتی ہے وہ انسان کی حیاتِ ابدی نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ کی حیاتِ ابدی ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں بڑھ رہا ہوتا بلکہ خدا بڑھ رہا ہوتا ہے۔ دنیا میں کون ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑے سے بڑا انسان ہو جو یہ کہہ سکے کہ وہ خدا تعالیٰ کی مدد کے بغیر ایک سیکنڈ بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک سیکنڈ کیا سیکنڈ کا اربواں حصہ بھی کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

پس مَابَعْدَالْمَوْت اگر انسان کو ابدی زندگی ملتی ہے تو محض اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کی گود میں آ جاتا ہے اور چونکہ خدا ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اس لئے وہ بھی ہمیشہ کیلئے زندہ ہو جاتا ہے۔ تو بندے کے تمام کام دراصل ظلّی ہوتے ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنی شان میں یہ فرماتا ہے کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[؎] تو لازماً بندوں کے کاموں میں بھی رحمت کا پہلو وسیع ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے بندہ کسی مجرم کو بخشے گا اور کسی کی سزا کو کم کرے گا لیکن کسی مجرم کو وہ سزا بھی دے گا کیونکہ وہ صرف رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[؎] کا مظہر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیتِ یوم الدین کا بھی مظہر ہے۔ پس جس جس مقام پر وہ خدا تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اس مقام کے مناسب حال وہ سلوک کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیوں ایسا کام کرتا ہے جو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا کام ہے، اس لئے کہ جو اس کی مالکیت کا ظِلّ ہے وہ اس صفت میں اس کا

مظہر نہ بنے تو کیا کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سزا کے مقام پر صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا مظہر بنے، چشم پوشی یا احسان کے موقع پر صفتِ رحمانیت کا مظہر بنے، پرورش کے موقع پر صفتِ ربوبیت کا مظہر بنے اور انعامات کے موقع پر صفتِ رحیمیت کا مظہر بنے۔ ہاں اگر وہ ان صفات کے خلاف چلتا ہے تب بے شک اعتراض کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت کا ظہور ضروری ہوتا ہے تو یہ رحمانیت کی صفت ظاہر کرنے لگ جاتا ہے اور جب رحیمیت کی صفت جلوہ گری ضروری ہوتی ہے تو ربوبیت کا اظہار کرنے لگ جاتا ہے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رحمٰن کیوں ہے، یہ رحیم کیوں ہے، یہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کیوں ہے اور یہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کیوں ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ کسی موقع پر رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوتا ہے اور کسی موقع پر رحمٰن، کسی موقع پر رحیم ہوتا ہے اور کسی موقع پر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ یہی حال بندے کا ہے اسے بھی مختلف موقعوں پر مختلف صفات کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ ہاں جو چیز اعتراض کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ خدا کسی کو معاف کررہا ہو اور یہ اسے سزا دینے کے درپے ہو۔ یا خدا سزا دینے کے درپے ہو اور یہ اسے معاف کررہا ہو۔ یہ قابلِ اعتراض بات ہے اور یہ نہیں ہونی چاہئے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کیوں کسی وقت سزا دی جاتی ہے اور کسی وقت معاف کردیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں دیکھ لو اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کیا کرو کیونکہ درگزر کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے کہ جب فلاں قسم کے مجرموں کو سزا دی جارہی ہو تو یاد رکھو اگر اُس وقت تمہارے دل میں ذرا بھی رحم پیدا ہؤا تو تم اللہ تعالیٰ کو ناراض کرلو گے۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو معاف کرو اور دوسری طرف یہ فرماتا ہے کہ دیکھنا تمہارے دل میں بھی رحم نہ آئے۔ رحم پیدا ہؤا اور تمہارا ایمان ضائع ہؤا۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شقاوتِ قلبی کی تعلیم دیتا ہے۔ یا جب کہتا ہے کہ معاف کرو تو بُزدل بناتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا منشاء اس میں ہمیں یہ بتانا ہے کہ جب میں کہوں کہ سزا دو تو تم سزا دو اور جب میں کہوں چھوڑ دو تو تم چھوڑ دو۔ جب میں رحمانیت کا جامہ پہن کر آؤں تو تم بھی رحمانیت کا جامہ پہن لو اور جب میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا جامہ پہن کر آؤں تو تم بھی رحمانیت کا جامہ اتار کر مالکیتِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا جامہ پہن لو۔ غرض جس جُبّہ

میں بھی میں ہوں وہی جُبّہ تمہارا ہو اور جو کچھ میں کروں وہی تم کرو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کئی دفعہ ایک مثال سنایا کرتے تھے جو بیسیوں دفعہ میں نے آپ کی زبان سے سُنی ہے۔ آپ فرماتے ہیں بندہ کا کام اسی رنگ میں رنگین ہو جانا ہے جو اسے خدا تعالیٰ بخشتا ہے۔ پھر آپ مثال سناتے اور فرماتے کہتے ہیں کوئی راجہ تھا، ایک دفعہ اس کے سامنے بینگن کا سالن رکھا گیا جو بہت عمدگی سے تیار کیا گیا تھا اور اسے بہت پسند آیا۔ اس نے دربار میں اُس کی تعریف کی اور کہا کہ بینگن معلوم ہوتا ہے بہت اچھی ترکاری ہے۔ یہ سنتے ہی ایک درباری ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا حضور بینگن کے کیا کہنے ہیں اس میں یہ خوبیاں ہیں، اس میں وہ خوبیاں ہیں۔ چنانچہ جتنی تعریفیں طب میں بینگن کے متعلق لکھی تھیں وہ سب اس نے بیان کر ڈالیں اور آخر میں کہنے لگا حضور! اس کی شکل بھی تو دیکھیں بالکل صوفی معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح صوفیوں نے سبز عمامہ پہنا ہوُا ہوتا ہے اور ان کا کالا جُبّہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی شکل اور رنگ اور وضع سب صوفیوں کی سی ہے۔ خیر بادشاہ جو چند دن مسلسل بینگن کھاتا رہا تو اسے بواسیر ہو گئی۔ حکیموں نے کہا حضور! آپ نے بڑی بے احتیاطی کی، اتنے دن جو مسلسل آپ بینگن کھاتے رہے ہیں اسی وجہ سے آپ کو بواسیر ہوئی ہے۔ بادشاہ نے یہ سُن کر بینگن کھانے ترک کر دیئے اور ایک دن دربار میں باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ بینگن بھی کچھ ایسی اچھی چیز نہیں ہوتے اس میں بھی کئی خرابیاں ہیں۔ یہ سُن کر وہی درباری کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا حضور! بینگن بھی کوئی ترکاریوں میں سے ترکاری ہے۔ اس میں یہ مضرّت ہے، اس میں وہ مضرت ہے۔ چنانچہ طب میں بینگن کی جس قدر مضرتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب اُس نے ذکر کر دیں کیونکہ طب میں ہر چیز کے فوائد اور نقصانات دونوں بیان ہوتے ہیں پھر آخر میں کہنے لگا حضور! اس کی شکل بھی تو دیکھیں کیسی منحوس ہے۔ جس طرح چور کے ہاتھ منہ کالے کر کے پھانسی پر لٹکایا ہوُا ہوتا ہے اسی طرح یہ بیل سے لٹکا ہوُا ہوتا ہے۔ لوگوں نے اُسے کہا ارے! یہ کیا، اُس دن تو تُو بینگن کی اتنی تعریف کر رہا تھا اور آج تو اس کی برائیاں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہنے لگا میں بینگن کا نوکر تھوڑا ہوں، میں تو راجہ کا نوکر ہوں۔ آپ فرماتے جب لوگ ایسے آقاؤں کی جو غلطیاں کر سکتے ہیں ایسی اطاعت کرتے ہیں تو ہم اُس آقا کی اتباع کیوں نہ کریں جو کبھی غلطی

نہیں کرتا اور جس کا ہر رنگ با موقع اور ضروری ہوتا ہے۔ ہم تو وہی کریں گے جو خدا تعالیٰ کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب تک کسی انسان کو ایسی ہی وابستگی حاصل نہ ہو وہ کبھی نجات نہیں پا سکتا کیونکہ انسان غلطی کرسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ غلطی نہیں کرسکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اِس وقت دن ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ اس وقت دن ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ رات ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ رات ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ نرمی کرو تو ہم بھی کہتے ہیں نرمی کرو اور جب وہ کہتا ہے سختی کرو تو ہم بھی کہتے ہیں سختی کرو۔ جب وہ کہتا ہے آگے بڑھو تو ہم بھی کہتے ہیں آگے بڑھو اور جب وہ کہتا ہے کہ پیچھے ہٹو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ پیچھے ہٹو۔ نادان کہتے ہیں کہ تم اپنی باتوں کو بدلتے ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نہیں بدلتے بلکہ وہی کچھ کہتے ہیں جو اُدھر سے ہمارے دل اور دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے پاس سے کچھ کہیں تو ہم پر اعترض ہوسکتا ہے لیکن جب ہماری ہر حرکت اور ہمارا ہر سکون خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہو تو یقیناً وہی بہتر ہو گا جو خدا کا منشاء ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے پہلے حضرت مسیحؑ پر اپنی فضیلت صرف جُزئی قرار دی تھی مگر اب فرماتے ہیں کہ میں اپنی تمام شان میں اس سے بڑھ کر ہوں۔ تو آپ نے اس کے جواب میں یہی فرمایا کہ میں تو خدا تعالیٰ کی وحی کی پیروی کرنے والا ہوں۔ جب تک مجھے اُس سے علم نہ ہؤا میں وہی کہتا رہا جو اوائل میں مَیں نے کہا اور جب مجھے اُس کی طرف سے علم ہؤا تو میں نے اُس کے مخالف کہا۔ میں انسان ہوں مجھے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں۔

تو نبی بھی جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے آواز نہیں آتی، قوم میں مروجہ خیالات کی پیروی کرتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ کی آواز آتی ہے تو وہ فوراً ان خیالات کو پھینک دیتا ہے۔ مثنوی رومی والے اسی امر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے بندوں کی مثال بانسری کی طرح ہوتی ہے۔ اب بانسری آپ تھوڑی بول رہی ہوتی ہے اس میں تو جو کچھ پھونکا جاتا ہے وہی وہ باہر نکال دیتی ہے۔ اسی طرح جو حقیقی مؤمن ہیں وہ بھی اپنے پاس سے کچھ نہیں کہتے بلکہ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہیں۔ خدا جہاں اُنہیں بٹھاتا ہے وہ وہاں بیٹھ جاتے ہیں، جہاں کھڑا کرتا ہے وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں، جو کہتا ہے وہ کہتے چلے جاتے ہیں اور جس سے روکتا ہے اس

سے رُک جاتے ہیں۔ جب یہ رنگ کوئی شخص اختیار کر لے تب وہ واقع میں مؤمن کہلا سکتا ہے۔ ورنہ نہ ہر جگہ نرمی اچھی ہوتی ہے نہ ہر جگہ سختی۔ مؤمن صرف یہ دیکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے دین کا فائدہ کس میں ہے۔ اگر اس کے دین کا فائدہ سختی میں ہو تو وہ سختی کرتا ہے اور اگر اس کے دین کا فائدہ نرمی میں ہو تو وہ نرمی کرتا ہے۔ جب خدا اسے کہتا ہے کہ میرے دین کا فائدہ اِس وقت نرمی میں ہے تو وہ اتنا نرم بن جاتا ہے کہ پانی بھی اتنا نرم نہیں ہوتا اور جب وہ کہتا ہے کہ میرے دین کا فائدہ سختی میں ہے تو وہ اتنا سخت بن جاتا ہے کہ لوہا بھی اتنا سخت نہیں ہوتا۔ اس کی نہ سختی اصلی ہوتی ہے نہ نرمی اصلی ہوتی ہے اصل چیز تو وہ عشق اور محبتِ الٰہی ہوتی ہے جو اس کے دل میں مخفی ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی آنکھ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جس سے اُس کی آنکھ پھرے اُس سے وہ بھی پھر جاتا ہے اور جس پر وہ رحمت کی نگاہ ڈالے اُس سے وہ بھی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ جب خدا کسی کو غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو بغیر ایک منٹ کے تردّد کے وہ بھی اس پر غضبناک ہو جاتا ہے اور جب خدا کسی کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو بغیر ایک لمحہ کے توقّف کے وہ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں جس کی اتباع کر رہا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ فلاں غضب کا مستحق ہے اور فلاں رحمت کا۔ یہ وہ مقام ہے جس کے حصول کی طرف اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ توجہ دلائی ہے اور منعم علیہ گروہ وہ ہے جس کی دوسری جگہ یہ تشریح کی گئی ہے کہ اس میں نبی، صدیق، شہید اور صالح شامل ہیں۔ گویا منعم علیہ گروہ وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں جاری کرتا ہے کیونکہ سب سے بڑی نعمت اس کی صفات کا آئینہ قلب میں منعکس ہونا ہی ہے۔ نبوت کیا ہے؟ وہ خدا تعالیٰ کا ایک آئینہ ہے۔ صدیقیت کیا ہے؟ وہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک آئینہ ہے۔ شہادت کیا ہے؟ وہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک آئینہ ہے۔ اور صالحیت کیا ہے؟ وہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک آئینہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی مستقل آئینہ ہے، کوئی عارضی، کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا۔ کوئی تھوڑی دیر کیلئے آئینہ اور کوئی زیادہ دیر کیلئے مگر بہر حال اپنی ذات میں وہ کچھ نہیں۔ وہ صرف خدا تعالیٰ کا انعکاس ہیں اور اگر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ کا محبت کی زبان میں ہم ترجمہ کریں تو یوں ہوگا کہ وہ لوگ جن کی طرف تُو نے منہ کر کے دیکھ لیا۔ اب جس آئینہ کی طرف

محبوب منہ کر کے دیکھتا ہے اُس میں اُس کی شکل بھی آجاتی ہے۔ پس صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے خدا تعالیٰ کا چہرہ دیکھ لیا اور اُنہوں نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر تم خدا تعالیٰ کی شکل دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارے دل کے آئینہ میں اس کی شکل دیکھ لو۔ پس ان کا لوگوں کے ساتھ جو بھی معاملہ ہو خدا تعالیٰ کی طرز پر ہوتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے نرمی کرو تو وہ نرمی کرتے ہیں۔ جب کہتا ہے دلیری دکھاؤ تو دلیری دکھاتے ہیں۔ جب کہتا ہے خاموش رہو تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ جب کہتا ہے بولو تو بولتے ہیں۔ جب اس مقام کو کوئی جماعت حاصل کر لیتی ہے تو اس کے بعد خدا تعالیٰ کا ظہور اس کے ذریعہ ہونے لگتا ہے لیکن جو قوم اپنے آپ کو اس کا آئینہ نہیں بناتی اس میں اس کی شکل نظر نہیں آسکتی۔ کیا مٹی کے ڈھیلے لے کر تم لوگوں کو تصویریں دکھا سکتے ہو؟ مٹی کے ڈھیلوں میں تصویر نظر نہیں آتی بلکہ تصویر اُس وقت نظر آئے گی جب تمہارے پاس آئینہ ہوگا اور آئینہ بھی وہ جس کا محبوب کی طرف منہ ہو۔

پس تم اپنے آپ کو خدا نما آئینہ بناؤ اور اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے حکم کے مطابق تمام دنیا کو محبوب ازلی کے خوبصورت چہرہ سے روشناس کرو کیونکہ آئینہ صرف اپنے اندر ہی تصویر نہیں لیا کرتا بلکہ دوسروں کو بھی دکھا دیتا ہے۔ پس تم بھی ایسے بنو کہ تمہارے اندر خدائی نور نظر آئے اور تمہارے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کا منشاء ظاہر ہو۔ جب تم سختی کیلئے کھڑے ہو تو اس لئے مت کھڑے ہو کہ تمہارا نفس تمہیں کہتا ہے کہ تم سختی کرو بلکہ تم اس لئے سختی کرو کہ تمہارا خدا کہتا ہے میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہوں اور تمہارا فرض ہے کہ تم اِس صفت کے مظہر بنو۔ اسی طرح جب نرمی کیلئے کھڑے ہو تو اس لئے مت نرمی کرو کہ تمہارا نفس تمہیں نرمی کا مشورہ دیتا ہے بلکہ اس لئے نرمی کرو کہ تمہارا خدا کہتا ہے رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[۵] اور تمہارے خدا کا یہ حکم ہے کہ تم اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ اسی طرح جب بنی نوع انسان سے شفقت اور احسان کے ساتھ پیش آؤ تو اس لئے شفقت اور مروت مت کرو کہ ذاتی طور پر تمہارے دل میں شفقت کا خیال پیدا ہؤا ہے بلکہ اس لئے شفقت کرو کہ تمہارا خدا کہتا ہے کہ میں رحمٰن اور رحیم ہوں اور تمہارا فرض ہے کہ صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کے مظہر بنو۔ اسی طرح جب تم بیکسوں اور غریبوں کی خبر گیری کرو، جب تم یتیموں کی پرورش کرو، جب تم بیواؤں پر ترس کھاؤ تو ان کی

خبر گیری اور پرورش اس لئے نہ کرو کہ تمہارے دل میں اس کا خیال پیدا ہوا ہے بلکہ اس لئے کرو کہ ربُّ العٰلمین خدا تمہارے سامنے جلوہ گر ہے اور تمہارا فرض ہے کہ اس کی ربوبیت کا جامہ پہن لو۔ غرض تم اُس وردی کے پہننے والے ہو جو تمہارا افسر پہنتا ہے۔ جس طرح بادشاہ جس قسم کی وردی پہنتا ہے اُسی کی نقل سپاہیوں کو پہنائی جاتی ہے۔ اسی طرح تمہارا بھی فرض ہے کہ تم اپنے ازلی اور ابدی بادشاہ کی طرف دیکھو اور جو اُس کا لباس ہو وہ پہنو۔ اور یاد رکھو کہ جس طرح وہ سپاہی جو بادشاہ کا مقرر کردہ لباس نہیں پہنتا اُس کا نام فوج میں سے کاٹ دیا جاتا ہے اسی طرح وہ شخص جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے آئینۂ قلب میں منعکس نہیں کرتا اور نہ ان صفات کے مطابق اپنے معاملات رکھتا ہے، اُس کا نام اللہ تعالیٰ کے حضور مؤمنوں کی فہرست میں سے کاٹ دیا جاتا ہے۔'' (الفضل ۱۰؍جون ۱۹۳۸ء)

۱؎ الفاتحة: ۶، ۷

۲؎ بخاری کتاب الصوم باب هَلْ يَقُوْلُ اِنِّی صَائِمٌ اِذَا شُتِم

۳؎ البقرة: ۱۸۷ ۴؎ النمل: ۶۳ ۵؎ الضّحٰی: ۱۲

۶؎ بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوة فی الْاِسْلام

۷؎ النور: ۵۶

۸؎ بخاری کتاب الایمان باب سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِیَّ صلی الله علیه وسلم عن الایمان (الخ)

۹؎ بخاری کتاب الجمعة باب الطِّيْبُ لِلْجُمُعَةِ

۱۰؎ الاعراف: ۱۵۷